

ہمارا نصابِ تعلیم اور شیعہ اندازِ فکر

اقوام کی تہذیب و تمدن کی ترقی و زوال میں جو اہمیت نصابِ تعلیم کو حاصل ہے۔ وہ کسی صاحبِ دانش پر مخفی نہیں۔ یعنی اگر کسی قوم کا نصابِ تعلیم ان کے صحیح افکار و نظریات کا عکاس ہو گا تو یقیناً اس کی نسل نو اس قابل ہو گی کہ وہ اپنے اسلاف کی دراست کو محاذِ سنہال سکے اور اگر ان بچوں کو دی جانے والی تعلیم ایسی نہ ہو جس میں اسلاف کے کارہائے نمایاں کا ذکر ہو، قومی نظریات و افکار کا تذکرہ نہ ہو تو پھر نوجوان نسل سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قومی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔

جہاں یہ خیال است و محال است و جنوں

ہم اگر موجودہ دورِ انحطاط کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا، جہاں اور بہت سی سیاسی اخلاقی مفاسد نے ہمیں یہ روزِ سیاہ دکھایا ہے وہاں ایک بہت بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی نوجوان نسل کی صحیح تربیت نہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان نظریات سے نہ صرف فُور ہوئی بلکہ ان کی مخالف ہوئی چلی گئی۔ یہی نظریات ہماری میراثِ افتخار تھی۔ اور اس یورش میں تمام سے زیادہ دخل نصابِ تعلیم کا ہے مثلاً برصغیر میں برطانوی استعمار کے خلاف ہمارے اسلاف۔ جن میں خاندانِ صادق پور، پٹنہ وغیرہ سرفہرست ہیں۔ نئے آواز اٹھائی تو اس آواز کو دبانے کے لیے برطانوی استعمار نے متعدد حربے استعمال کیے، ان میں سے ایک طریقہ جسے کامیاب طریقہ کہنا بے جا نہ ہوگا، یہ تھا کہ مسلمانوں کے بچوں کو ایسا نصابِ تعلیم دیا کہ وہ از خود غیر شعوری پر اپنے نظریات سے نہ صرف یہ کہ مغرور ہوں بلکہ ان کے مخالف بن جائیں یہ تعلیمی انقلاب کیسے لایا گیا ایک طویل داستان ہے لیکن اس کا مقصد وحید سی تھا کہ مسلمانوں کی اولاد کو تعلیمی طور پر اس قدر مغرور کر دیا جائے کہ اسلام سے ان کا رشتہ ہٹائے نام باقی رہے اور اپنی تہذیب و تمدن کے اثرات اس طرح پھیلانے چاہیں کہ انہیں نہ صرف یہ کہ ان کا علم

نہ ہو بلکہ وہ اپنی تہذیب سے دل برداشتہ ہوں اور اسے ایک عیب تصور کریں — چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس مغربی نصاب تعلیم نے ہماری نوجوان نسل کو ایسا گمراہ کیا کہ خود ہماری تہذیب ہماری زبان سے دُشمنانہ لہجے میں کہنے لگی۔ علاوہ ازیں درسگاہوں میں کلیدی آسیا میں ایسے افراد کو دلائی گئیں جو نہ صرف کہ خود اسلامی تہذیب کے مخالف ہیں بلکہ اپنے معاندانہ افکار سے دوسروں کو قائل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تاکہ وہ نسل کو کو باسانی اپنے دامِ تزویر میں پھنسا سکیں۔ اس نثری سازش کا تعلق اگرچہ مذہب سے زیادہ سیاسی سمجھا گیا تاہم طلبہ میں سیاسی و مذہبی گج مکاری، تہذیب و اخلاق سے بیزاری اور قومی دلی نظریات و افکار سے لاعلمی و بے تعلقی، اس سازش کے ثمرات ہیں۔ لیکن اس المیہ کی یہی انتہا نہیں بلکہ مزید افسوس یہ ہے کہ ہم نصاب تعلیم کی انقلابی و اصلاحی اہمیت و ضرورت کا اعتراف کرنے کے باوجود ان جو انیم کو اپنی درسگاہوں سے باہر کالے کا اہتمام نہیں کرتے۔ ہماری ہر حکومت نے بارہا ایسا قدم اٹھانے کا سوچا ضرور لیکن اسکو عملی جامہ پہنانے سے دانستہ و نادانستہ تہی دامن رہی۔

بہر حال یہ داستان دلگداز تو بہت طویل ہے جو کسی دوسری مجلس کی متقاضی ہے، سرِ دست ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں کہ ہمارے نصاب تعلیم میں شیعہ اندازِ فکر نے کیسے جگہ لی؟ اس اندازِ فکر اور مغربی سوچ میں جو گہرا تعلق نسلاً بعد نسل چلا آ رہا ہے وہ کسی پر مخفی نہیں چنانچہ ماضی قریب میں دینیات کے عنوان میں جس تخریب کاری کی تحریک کو چلایا گیا وہ یقیناً مغربی اشارہ پر نہ تھی اس کی تائید میں ضرور تھی کہ مسلمان نسل کو اسلام کی خشتِ اول ہی کے متعلق غلط سوچنے کا موقع فراہم کیا گیا، اس اندازِ فکر پر مبنی سازش سے ہم نے ایک پمفلٹ بنام ”کاری سازشی نتیجہ عوامی لغات“ میں پردہ اٹھایا اور مختصر طور پر اس کے مضمرات و اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ یہ تو بہر حال حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے سوچے کہ نصاب تعلیم سے متعلق ایسی سازش کیوں اور کہاں ہوتی ہے؟ جس کے نتیجے میں نوجوان نسل ملک و دین سے برگشتہ و دل برداشتہ ہو جاتی ہے اور وہ اپنے تہذیب و تمدن کو ترک کر کے مغربی تمدن کو ترجیح دیتی ہے۔ سرکاری مدارس کے رائج الوقت نصاب تعلیم کا تو یہ عالم ہے ہی کہ اس میں علیحدتِ یہودیت اور افکارِ مغرب کو ایسے انداز میں سمویا گیا کہ عام قاری اور مبتدی اس کا اتنی جلد

احساس نہیں کر پاتا، جتنی جلد اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس انداز فکر کی ریشہ دوانیوں سے مذہبی درسگاہوں کا انصاف تعلیم بھی محفوظ نہ رہ سکا، مثلاً اس دماغ کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ عوام کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نعوذ باللہ برگشتہ و قنفر اور دل برداشتہ کیا جاتے، حالانکہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہیں جن کی معرفت ہم تک دین حنیف کی یہ نعمت عظمیٰ من وعن پہنچی۔ اگر اس واسطہ و رابطہ کو ختم یا کمزور کر دیا جائے تو اس کے علاوہ اور کیا نتیجہ ہو گا کہ دینی اقدار و روایات کا نہ صرف چہرہ مسخ ہو جائے گا بلکہ وہ کلیۃً لیساً منیاً ہو جائیں گی اور یہی مقصد ہے اس سیاست و سازش کا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علوم فنون کی کتابوں مثلاً نحو و صرف اور معانی و مطالب میں ایسی مثالیں لائی جاتی ہیں جو شیعہ انداز فکر کا شاخصانہ معلوم ہوتی ہیں۔ اگر یہ مکتب اہل تشیع کی تصانیع ہوتیں تو ہمیں اتنا افسوس نہ ہوتا۔ صدمہ تو اس بات پر ہے کہ لکھنے والے اہل سنت ہیں لیکن ذہن شیعہ انداز فکر سے محفوظ نہیں۔ مثلاً نحو کا مشہور مسئلہ ہے ”المحذوف التحذیف“ یہ حروف چونکہ فعل کے صدر پر انگیزت اور کام پر آمادہ کرنے کے لیے آتے ہیں، اسی وجہ سے انھیں حروف تحذیف کہا جاتا ہے اور یہ چار ہیں۔ ”ہلا، الا، لولا اور لوما“ ان میں سے لولا ایک تو اپنے اصل مبحث کے اعتبار سے معنی ادا کرتا ہے، دوسرا یہ پہلے جملہ پر دوسرے جملہ کے نتیجتاً موقوف ہونے کے لیے آتا ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”لولا ینی ھو الربانیون والاحبار عن قولہم الاثم والھم

السحت لبئس ما کانوا یصنعون“ (ماائدہ ۶۳)

”لیکن فن کی متعلقہ مکتب میں جو مثال پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے:

”لولا علی لم ملک عمر“

یعنی ”اگر حضرت علیؑ نہ ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتے۔“

اسے کاپس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے کسی حاملہ عورت

کے رحم کا حکم دیا تو حضرت علیؓ نے سمجھا یا کہ وضع حمل سے قبل اسے سزا نہیں دی جاسکتی۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ سے رجوع کرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ اب اس

جملہ سے اہل تشیع نے یہ مفہوم اخذ کرتے ہوئے نعوذ باللہ حضرت عمرؓ کی تخفیف کی مذہب کوشش

کی ہے کہ دیکھیے ان کا علم کتنا سطحی تھا کہ حدود جیسے اہم مسائل سے بھی ناواقف ہیں۔

اس کے اصولی طور پر اگرچہ متعدد جواب ہو سکتے ہیں کہ اولاً حضرت عمرؓ کا حاملہ عورت کے رحم کا حکم دینا موضوع روایت اور محض الزام تراشی ہے اور اسی طرح مجنونہ کے رحم کا ارادہ کرنا اور اس سے رجوع بھی اہل سنت کی کسی کتاب میں بسند صحیح ثابت نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو منہاج السنۃ اور السیف المسلول وغیرہ۔ دوم یہ کہ بغرضی محال اگر ایسا ہوا ہے تو اس میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غیبت و منقبت ہے نہ کہ عیب و نقص۔ کیونکہ جمیع علم کا احاطہ انسان کے بس کا روگ نہیں۔ البتہ جب حق واضح ہو جائے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ایک ایسی مزیت ہے کہ:

۵۔ ایں سعادت بزدور ہارون نیست

نارنج خدائے بخشندہ :

سوم یہ کہ اگر اس میں نفوذ باللہ حضرت عمرؓ کی کم علی کا پہلو ہے تو پھر معدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے ہیں جنہوں نے کوئی فتویٰ دیا اور پھر حق واضح ہونے پر رجوع کر لیا۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً حضرت علیؓ نے جب بعض غالی شیعہ کو آگ کا عذاب دینا چاہا تو حضرت ابن عباسؓ نے حدیث سنائی کہ:

”لا یعذب بالنار الا رب النار“

یعنی ”آگ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی عذاب دے سکتے ہیں!“

تو آپؓ نے رجوع کر لیا، اسی طرح آپؓ نے غالباً ایک عورت سے کہا تھا کہ تم عدت اپنے گھر میں گزارو، حالانکہ اسے یہ عدت اپنے خاوند کے گھر میں گزارنا تھی۔ تاہم ان باتوں سے حضرت علیؓ کی تقیص و تخفیف کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

چہارم اہل تشیع کے مشہور عالم محمد بن بابوی قمی ”من لایحضرہ الفقیہ“ میں لکھتے ہیں، کہ ”حضرت علیؓ نے ایک نابالغ لڑکے پر چوری کی حد مارنے کا حکم دیا۔ (السیف المسلول) فہماکان جوابکم فی وجوبہا۔“

غرضیکہ ان جوابات سے قطع نظر صرف و نحو میں ایسے مسائل پیش کرنا ہے تو صرف قرآن حدیث ہی سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً

”ولو لا فضل اللہ علیکم ورحمۃ فی الدنیا والآخرۃ لم یسہل“

فی ما افضنتم فیہ من عذاب الیم“ (النور: ۱۷)

”لولا ان تدارك نعمة من ربه لبذ بالعراء وهو مذموم“

(القلم ۳۹)

”لولا ان اشق علی امتی لا مرتمة“ (الحديث)

افسوس! ہمارے مصنفین و شارح و مدرّسین ایسے امثالہ خارج کرنے کی بجائے خاموشی سے گھنٹوں مسائل پر تفسیریں نو کرتے ہیں لیکن اس غیر شعری طرز پر اٹھنے والے فتنہ کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہیں۔

اسی طرح علم معانی کی تقریباً تمام کتابوں کی یہ مثال اہل علم کے سامنے ہو گئی کہ:

”رکب علی و هرب معاویة“

مبحث کے لحاظ سے مثال کا اطلاق خواہ کچھ بھی ہو لیکن مشابہت صحابہ کے سلسلہ میں جس طرح حب علی نہیں بغض معاویہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ کیا یہ اہل سنت کی نوجوان نسل کو متاثر کرنے کی ناپاک سازش نہیں؟ ہمارا ایمان ہے کہ صحابی ہونے کی حیثیت میں دونوں اصحاب پیغمبر علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں اور کسی مذہبی یا سیاسی آرٹ میں جو بھی ان کے خلاف ہرزہ سرائی کرے گا، وہ دائرۃ ایمان سے خارج ہے اور مشابہت صحابہ نہیں ہمارا مسلک یہی ہے کہ:

”ولولا اذ سمعتموه قلتم ما یكون لنا ان نكلمه ی هذا سبطك“

هذا یحییٰ بن عظیم (النور ۱۶)

اسی طرح کتب نحو کا ایک مبحث ہے، حروف جارہ — ان حروف میں سے ایک حرف ”من“ ہے جو نسبت کے لیے بھی آتا ہے تو اس جگہ پر مصنفین نے مثال ذکر کی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علیؑ سے فرمایا تھا:

”انت منی بمنزلة هارون من موسى“

یہ حدیث جہاں سند کے اعتبار سے نہایت کمزور ہے وہاں واقعات و حقائق اور معنی کے لحاظ سے بھی غیر مستقیم ہے جبکہ اس کی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو بکرؓ سے یہ فرمان بھی ثابت ہے کہ:

”انت منی بمنزلة هرون من موسى“

اور یہ حدیث روایت و درایت پہلی روایت سے زیادہ خرمین صحت و ثقیل و حقائق ہے۔ یعنی نسبت خلافت میں جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

خلیفہ برحق تھے۔ اسی طرح حضرت ابو بکرؓ نسبتِ خلافت میں اولین مستحق اور لائق خلافت تھے، اگرچہ اس حدیث میں نسبِ تعلق مراد لے کر معنی صحیح کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے لیکن وہ مفید مدعی نہیں اور اصل سوال یہ ہے کہ اہل سنت کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خلافت جیسے اہم مسئلہ میں نوجوان نسل کے ذہن ایسی امثلہ سے مسموم کرنے کا موقع دیں جبکہ اور بہت سی امثلہ پیش کی جاسکتی ہیں؛ بہر حال ہم ان امثلہ کو ”مشتہ نمونہ از خوارے“ کے طور پر عوام و خواص کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اگر واقعہ اپنی نوجوان نسل کو راہِ راست پر چلانا ہے تو نصابِ تعلیم کو درست کرنا ہو گا اور اس سے سبائیت دیہودیت اور مغربیت کی پیدا کردہ ریشہ دوانیوں اور شکوک و شبہات کو خارج کر کے نسل کو کو تحفظ بخشنے ہوئے اس قابل بنانا ہے کہ وہ ان سازشوں کا کماحقہ دفاع بھی کر سکیں۔ ہم اربابِ اقتدار اور درسِ نظامی کے اصحاب اختیار نیز مسند تدریس کے جانشینوں سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ نصابِ تعلیم سے ان جزائیم کو نکالنے کی کوشش کریں اور بوقتِ درس طلبہ کو ان سازشوں سے آگاہ و خبردار کریں تاکہ ہماری نوجوان نسل صحیح طور پر اسلامی تہذیب و تمدن سے آراستہ ہو سکے اور اپنے اسلاف کی صحیح جانشین بن سکے۔

وما علینا الا البلیغ

